رسائل و مسائل

ایمان بالرسالۃ

جمادی الاولیٰ کے رسالہ ترجمان القرآن کے صفحہ ۵۵ پر ایمان بالرسالت کے متعلق عالمانہ تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے ناقص خیال میں ایک دو پہلو ابھی حل طلب ہیں جو مختصراً معروض ذیل ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو جو ایسے مضامین پر ترجمان القرآن میں بصورت مذاکرہ علمیہ اظہار خیال ہوتا رہے۔

(۱) آپ فرماتے ہیں کہ "انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لیے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے .... لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لیے چند شرائط ہیں اور ادنیٰ تامل سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں" اس کے بعد ان شرائط کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ فرمودہ الٰہی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے مطابق ہر شخص اپنی وسعت و علم اور فکر تک مکلف ہو جیسا کہ شروع سوال میں مذکور ہے۔ اگر تربیت، ماحول اور استعداد ذاتی تکمیل شرائط میں ناقص ہیں تو اس کی ذمہ داری اس متجسس پر کیوں عاید ہو؟ انتخاب طریقت میں اس نے اپنی لیاقت کے مطابق تفکر اور تعقل سے کام لیا اور اسی حد تک وہ مکلف تھا۔ اسکو مورد الزام و عذاب کرنا بظاہر تکلیف ما لا یطاق ہے۔

(ب) جناب فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں جس میں ترتیب کے ساتھ ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ یہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے نجماً نجماً نازل ہوتی رہی ہیں"، مگر پھر بھی ارشاد ہوتا ہے کہ سورۃ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارہویں رکوع تک مسلسل پڑھا جائے تاکہ تناقض کا شائبہ تک نہ رہے۔ سوال بھیجنے سے پہلے بھی پڑھا تھا اور دوبارہ بھی ان سب آیات کو پڑھا ہے مگر مشکل رفع نہیں ہوتی۔ اہل کتاب کے جھگڑوں، عند، شرک، مکر وغیرہ کو دیکھ کر ایک معتدل روش کی طرف دعوت دی گئی تھی کہ "تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" الخ۔ ان کلمات اور اس دعوت کا کیا مفہوم اور مقصد تھا؟ بظاہر تو یہی ہے کہ تم اگر اپنی سچی تعلیم پر عمل کروگے اور شرک چھوڑ دو گے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں تم اور ہم یکساں ہونگے۔ دل نہیں مانتا کہ یہ الفاظ یونہی رسمی طور پر دفع الوقتی یا رفع الزام کے لیے کہے گئے اور کہ فی الحقیقت اشتراک فی العمل مدعوت مقصود نہ تھا۔

(ج) سوال لکھتے وقت فی الذہن اہل کتاب ہی تھے اور آیات مرقومہ اسی لیے استشہاداً پیش کی گئی تھیں۔ جہاں کہیں اہل کتاب کے اس گروہ کی تعریف کی گئی ہے جو دیانت دار تھے۔ خداترس تھے۔ امین تھے شب گزار تھے بعض مفسرین نے اسکی وہی تفسیر کی ہے جس کی طرف جناب گئے ہیں کہ یہ وہ گروہ ہے جو مسلمان ہو چکا تھا۔ جیسے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ انصاری، جبران وغیرہم۔ مگر افسوس کہ اس سے تسلی نہیں ہوتی اور نہ ہی الفاظ قرآن اس کے حامی ہیں مثلاً آیت وَلَوْ اٰمَنَ اَہْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّہُمْ مِنْہُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَکْثَرُہُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ کے ترجمہ میں آپ یہ فرماتے ہیں کہ "ان میں سے تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"، مومنون اور فاسقون دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہیں

اور دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں ان میں سے ایک کے معنی ماضی کے لیئے اور دوسرے کے حال کے اور پھر الفاظ منہم اور اکثرہم کے مفہوم کو متعین نہ کرنا تسلی بخش نہیں کما لا یخفی علی المتامل۔ مگر دوسری آیت واضح ترین ہے جس میں ایسی تاویل کی گنجائش ہی نہیں اور جس کا ترجمہ جناب نے نہیں فرمایا یعنی لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۔ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۔ (سب کے سب برابر نہیں اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی آیتیں راتوں کھڑے پڑھتے رہتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور روز آخرت پر، نیک کاموں کا حکم کرتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین میں سے ہیں وہ کسی طرح کی بھی نیکی کریں گے اسکی ہرگز ناقدری نہ ہوگی اور اللہ متقین کو خوب جانتا ہے) اسکی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے، جس میں نصاریٰ کی تعریف کی ہے کہ ان میں دیندار طبقہ ہے اور وہ متکبر نہیں ہیں۔ اگر آیات مذکورہ سے مراد وہی اہل جو جناب لے رہے ہیں تو فصاحت اور بلاغت قرآنی کو مدنظر رکھتے ہوئے، الفاظ مختلف ہوتے۔

(د) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ کے متعلق جناب فرماتے ہیں کہ "اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے ہیں، دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ پھر فرمایا گیا کہ اگر تم

دونوں باتیں اختیار کروگے تو تم کو خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور انکی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا ایک حصہ ملیگا، اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے مثلاً وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتَابِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ،، مگر ان سب آیات کو ملا کر جو نتیجہ آپ نے آخر مضمون میں نکالا ہے کہ تعجب انگیز ہے یعنی "ان کو اللہ کی رحمت کا صرف آدھا حصہ ملیگا کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہوگی ،، تیلی بھی کیا اور دوکھا کھایا۔

کم علمی کی وجہ سے یہ شکوک سوجھے ہیں اگر جناب و دیگر علمائے کرام مزید توجہ فرما کر ان کو رفع کریں گے تو انشاء اللہ عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔ ایک مسلمان

ترجمان القرآن - آپنے جو اعتراضات پیش فرمائے ہیں ان کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں :-

(۱) آپ کا استدلال اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف منکر رسالت کو برسر حق تسلیم کرنا لازم آئے گا بلکہ ہر شخص کے مسلک کو اسکی حد تک صحیح مان لینا لازم آجائے گا خواہ وہ مشرک ہو، یا دہریہ یا کوئی اور۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک مکلف ہے، اور تلاش حق میں غلطی یا کوتاہی کی ذمہ داری اس پر کچھ نہیں ہے، تو جس طرح وہ موحد مورد الزام و مستحق عذاب نہیں ہے جو غور و فکر کے باوجود رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتا ہے، اسی طرح وہ مشرک بھی کسی عقوبت کا مستحق نہ ہونا چاہیئے جو "نیک نیتی" کے ساتھ کسی پتھر یا درخت یا جانور کو خدا سمجھتا ہے اور وہ دہریہ بھی کسی سزا کا مستوجب نہ ہونا چاہیئے جو سرے سے خدا ہی کے وجود میں "نیک نیتی" کے ساتھ شک رکھتا ہے کیونکہ یہ سب بھی اپنی وسعت علم و فکر ہی مکلف ہیں اور ان کے علم و فکر کی رسائی بھی وہیں تک ہے جہاں تک وہ پہنچے ہیں۔ اس قاعدہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو مومن اور کافر اور مشرک کا امتیاز سراسر لغو قرار پائے گا، اور تبلیغ دین کے لیے

سرے سے کوئی عقلی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی، کیونکہ دین جن باتوں کی طرف بلاتا ہے ان کو اگر کوئی شخص اپنی کوتاہیٔ فکر کی بنا پر "گر بنیک نیتی" کے ساتھ رد کر دے، تب بھی وہ برسرِ حق ہی رہے گا، اور اپنے اس فعل کے لیے کسی الزام یا کسی سزا کا حق نہ ہوگا۔

آپ اس قاعدہ کی بنا آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا پر رکھتے ہیں۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اس آیت کا وہی مفہوم ہے جو آپ نے سمجھا ہے تو یہ آیت قرآن مجید کی پوری تعلیم کے خلاف ہے، اور اس صورت میں یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ قرآن نے دو بالکل متعارض اصول پیش کئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ انسان کو خدا اور اس کے ملائکہ اور کتابوں اور رسولوں اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کو نہ مانوگے تو کافر ہوگے اور تم کو آخرت میں سخت سزا دی جائے گی۔ دوسری طرف وہی قرآن (آپ کے زعم کے مطابق) کہتا ہے کہ تم صرف اپنی وسعت علم و فکر تک مکلف ہو، اور اگر تمہاری فکر کی رسائی ان پانچوں ایمانیات یا ان میں سے کسی ایک تک نہ ہو، اور اس نارسائی فکر کی بنا پر تم ایک کو یا سب کو ماننے سے انکار بھی کر دو، اور ان کے خلاف کوئی عقیدہ رکھو تب بھی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور تم کسی الزام سزا کے مستحق نہیں ہو۔ یقین مانیے کہ اگر قرآن مجید کی تعلیم میں حقیقتاً اتنا صریح تناقض موجود ہوتا تو کوئی صاحبِ عقل انسان اسکو خدا کی کتاب نہ مانتا۔

اس اشکال کا حل وہی ہے جو میں اپنے سابق مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ تکلیف ہی نہیں دی ہے کہ وہ خود اپنی محدود قوتوں سے اسکی معرفت تک پہونچنے اور اسکی بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کرے، خالقِ کائنات خوب جانتا تھا کہ انسان کی وسعتِ علم و فکر کہاں تک ہے۔ اسکو معلوم تھا کہ عام انسانوں کی قوتِ فکر اور صلاحیتِ اکتسابِ علم اتنی ہے ہی نہیں کہ وہ اس بلند مقام تک پرواز کر سکیں جہاں اس جیسی ماورائے سرحدِ ادراک ہستی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور نہ وہ اپنی فطری اور خارجی کمزوریوں سے اتنے پاک اور منزہ ہو سکتے ہیں کہ محض اپنے اجتہاد سے اس ذات کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر دیں۔ اس لیے اس نے ان کی وسعت و طاقت سے زیادہ ان پر تکلیف کا بار ڈالا ہی نہیں۔ اس نے تو ان میں سے خاص بندوں کا انتخاب کر کے ان کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا اور ان کو اس بات پر مامور کیا کہ اپنے ابنائے نوع کو اس کی نشانیاں کھول کھول کر بتائیں، اور ان کی عقل و فہم

کے مطابق انہیں تعلیم دیں۔ یَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۷: ۳۵) پس تکلیف جو کچھ بھی دی گئی ہے وہ اس امر کی ہے کہ انسان خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی سیرت اور ان کی تعلیم پر غور کرے، اور جب دیکھے کہ وہ جس راستے کی طرف بلا رہے ہیں اس میں انکی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے، نہ وہ جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والے ہیں، نہ کسی ایسی بات کی طرف بلا رہے ہیں جو تقویٰ اور صلاح کے خلاف ہو، تو ان پر ایمان لائے اور انکی پیروی کرے۔ اس تکلیف کو مالا یطاق نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہدایت کو انسان کے علم و عقل سے آشنا قریب کر دینے کے باوجود کوئی شخص نیک نیتی یا بدنیتی سے اس کو قبول نہیں کر سکتا، اور اس کے خلاف چلتا ہے تو اسکو اپنی اس کوتاہی کا انجام ضرور دیکھنا پڑے گا۔

آپ پھر پلٹ کر کہیں گے کہ اگر کوئی شخص اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک رسولوں کی سیرت اور انکی تعلیم پر غور کرنے کے باوجود انکی رسالت پر مطمئن نہ ہو سکے تو اس کوتاہی فہم و نارسائی فکر کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں اور اس کو مورد الزام و مستحق عذاب نہ ہونا چاہیئے۔ میں عرض کروں گا کہ جب کوئی شے انسان بحیثیت انسان کی عقل و فہم کے باہر ہو اور کوئی انسان اس تک نہ پہونچے تو البتہ وہ معذور ہے۔ کیونکہ اس شے کی یہ شان ہی نہیں ہے کہ انسان اس تک پہنچ سکے لیکن اگر کوئی چیز اس حد کے اندر ہو، اور اس کی شان یہ ہو کہ انسان بحیثیت انسان ہونے کے، اپنی عام بشری قوتوں کے ساتھ اس حد تک پہنچ سکتا ہو، اور پھر کوئی شخص اس تک نہ پہونچے تو یہ دو حال سے خالی نہ ہوگا۔ یا تو اس نارسائی میں اس کی خواہش نفس کا دخل ہوگا یا یہ نارسائی خالصۃً اسکی کوتاہی فہم پر مبنی ہوگی۔ پہلی صورت میں تو اس کے مجرم ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ رہی دوسری صورت تو آپ کو خواہ اس کم عقل انسان پر کتنا ہی رحم آئے، بہرحال اس سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی کوتاہ فہمی سے جس نتیجہ پر پہونچا ہے وہ حق نہیں ہے، اور یہ کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں کہ جو حق تک نہیں پہونچا ہے وہ انجام کار میں ان لوگوں کے برابر ہو جو حق تک پہونچ گئے ہیں۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ہر شخص جو کچھ سوچے اور سمجھے گا اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک ہی سوچے اور سمجھے گا۔ اس حد سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا حق اور صداقت ہر شخص کی انفرادی

سمجھ بوجھ کے مطابق بدلنے والی چیز ہے یا ایک امر متعین ہے خواہ کوئی شخص اسکو سمجھے یا نہ سمجھے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو گویا آپ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ کوئی مخصوص عدد نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اپنی حد تک غور و فکر کرنے کے بعد نیک نیتی کے ساتھ جس عدد پر بھی پہنچ جائے وہی صحیح مجموعہ ہے خواہ وہ ۷۹ ہو یا ۸۱ یا ۸۰۔ مگر یہ ایسی غیر معقول بات ہے کہ آپ اس کے قائل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آپ کو لامحالہ دوسری شق ماننی پڑے گی یعنی یہ کہ ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ بہرحال ۸۰ ہے خواہ کسی کی عقل و فکر وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ۳۰ اور ۵۰ کے مجموعہ کو ۷۹ یا ۸۱ یا کچھ اور کہتا ہے، خواہ کوتاہ فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ ایسا کہے یا جان بوجھ کر بدنیتی کے ساتھ، دونوں صورتوں میں اس کا حساب غلط ہوگا۔ اس کی فرد حساب اس غلطی کی وجہ سے آخر تک غلط ہو جائیگی اور تمام محنت جو اس نے فرد تیار کرنے میں صرف کی ہے ضائع ہو جائے گی۔ نیک نیتی اور بدنیتی کا کوئی دخل حساب کی صحت و عدم صحت میں نہیں ہے۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ غلط حساب لگانے والے کو اس شخص کے برابر کر دیا جائے جس نے صحیح حساب لگایا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوگا کہ نیک نیت احمق کو اتنی سزا نہ دی جائے گی جتنی بدنیت شریر کو دی جائے گی۔

(۲) قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس سے یہ کہنا مقصود نہ تھا کہ آیات قرآنی میں کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ قرآن مجید میں ایک مسئلہ پر تسلسل کے ساتھ یکجا بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ جہاں جیسا موقع پیش آیا ہے مسائل کے اطراف میں سے ایک طرف یا چند اطراف کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والے کو لازم ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ پر کوئی رائے قائم کرنا چاہے تو ان تمام اطراف پر نگاہ ڈالے جو مختلف آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر صرف ایک آیت یا چند آیات پر حصر کرے گا اور دوسری آیات کو جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں، نظر انداز کر دے گا تو صحیح رائے قائم نہ کر سکے گا۔

(۳) تعجب ہے کہ آپ نے سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک بار بار پڑھا اور پھر بھی مشکل رفع نہ ہوئی۔ حالانکہ چھٹے رکوع کے آغاز ہی میں آپ دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ حضرت ابراہیم اور یعقوب اور یوسف اور موسیٰ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے ان کو بھی اس بنا پر

دنیا اور آخرت میں عذاب شدید کی دھمکی دی گئی ہے کہ وہ حضرت عیسٰی پر ایمان نہ لائے تھے۔ غور کیجئے کہ یہ لوگ مطلقاً رسالت کے منکر نہ تھے۔ صرف ایک رسول کا دعوائے رسالت سن کر انھوں نے اپنی وسعت علم و فکر تک غور کیا اور جب ان کا دل اس پر نہ ٹھکا تو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس پر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا وہ قاعدہ جو آپ تجویز فرماتے ہیں اللہ تعالٰی نے جاری نہ کیا بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ نہ صرف اس مقام پر بلکہ قرآن میں کسی دوسری جگہ بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس عذاب کی وعید سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو شرک سے مجتنب اور توحید و تقویٰ کے طریقہ پر قائم ہیں مگر حضرت عیسٰی کی رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتے ہیں۔

(۴) الجھن کی بڑی وجہ وہ آیت ہے جس میں اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء کی طرف بلایا گیا ہے، اور اس میں رسالت محمدی پر ایمان لانے کا ذکر نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ اس آیت پر بحث کی جائے، آیت کے اصل الفاظ سن لیجیے:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

(۷۱۳)

اے محمد کہو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں، اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا ارباب نہ بنالے۔ پھر اگر وہ اس دعوت سے روگردانی کریں تو کہدو کہ گواہ رہو، ہم مسلم ہیں۔

اس آیت میں کون سا لفظ ہے جس سے آپ نے یہ معنی نکالے کہ اس کلام سے مقصود یہود و نصاریٰ کو دعوت الی اللہ کے کام میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت عمل کی دعوت دینا تھا؟ اور یہ کہاں کہا گیا ہے کہ "اگر تم اپنی مسیحی تعلیم پر عمل کروگے اور شرک چھوڑ دوگے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں ہم اور تم یکساں ہونگے"؟ اور اس معنی کی طرف

کون سا اشارہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے والے ایمان لانے والوں کی طرح حق پر جب اوان کے برابر درجہ رکھتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے سامنے اپنا دعوائے رسالت پیش کیا اور وہ آپ سے جھگڑا کرنے لگے (جیسا کہ آیت مباہلہ میں اس آیت سے اوپر ہی بیان کیا گیا ہے) تو اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم ان کو اس بات کی طرف دعوت دو جو تمہارے اور ان کے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب اور اپنا الٰہ اور حقیقی متبوع نہ بناؤ۔

یہ تینوں باتیں وہ تھیں جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات میں موجود تھیں مگر یہود و نصاریٰ ان کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کو معبود بنا لیا تھا۔ یہودی اور نصرانی دونوں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگے تھے (وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ۔ ۹ : ۵) یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنے احبار اور رہبان اور مسیح کو ارباب بنا لیا تھا (اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا۔ ۹ : ۵) چونکہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا آغاز اسی سبب سے ہوا تھا کہ انھوں نے اصل موسوی اور مسیحی مذہب کی اس بنیادی تعلیم کو چھوڑ دیا تھا، اس لیے حکم ہوا کہ پہلے ان کو اس چیز کی طرف بلاؤ جو ان کے اصل مذہب کی بھی تعلیم ہے اور تمہارے دین کی بھی بنیاد ہے۔ اس دعوت سے دو فائدے مقصود تھے۔ ایک یہ کہ اہل کتاب میں سے جو تا حق پسند اور سلیم الطبع ہوگا وہ اپنے مذہب کے صدیوں سے متوارث عقائد باطلہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے گا اس کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کر لینے میں پھر کوئی مشکل حائل نہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس کلمۂ سوا کی دعوت سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو معلوم ہو جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُسی چیز کی طرف بلانے والے ہیں جس کی طرف عیسیٰ اور موسیٰ اور دوسرے

انبیاء علیہم السلام بلاتے تھے۔ پھر ان کی تصدیق کرنے والے کے لیے ان کی تکذیب کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے۔

یہ اس آیت کا صاف اور واضح مفہوم ہے۔ اس سے یہ بات کہاں نکلتی ہے کہ اہل کتاب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطالبہ نہ تھا؟ اور اس سے یہ بات کیسے نکالی جا سکتی ہے کہ اگر اہل کتاب صرف "اپنی سچی تعلیم" پر عمل کریں اور شرک چھوڑ دیں تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے یا آپ کی رسالت میں شک رکھنے کے باوجود ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہوں گے؟ کیا یہ آیت اس آیت کو منسوخ کرتی ہے جس میں تمام نوع انسانی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا .... فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ ..... لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۷ : ۲۰) اور کیا یہ آیت اس آیت کی بھی ناسخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو اس نبی کی نبوت اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو نہ مانے گا وہ خسران میں رہے گا۔ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۲ : ۱۴) اور کیا یہ آیت ان آیات کی بھی ناسخ ہے جن میں خاص طور پر اہل کتاب سے کہا گیا ہے کہ ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے (مائدہ ۳ - اعراف ۱۹) کیا قرآن میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے کہ کسی قوم کے پاس رسول بھیجا جائے اور وہ اسکو نہ مانے اور پھر بھی ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہی رہے؟ اگر خدا کی طرف سے آئے ہوئے رسول کو ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوں، اور نہ ماننے کی صورت میں بھی اسی طرح نجات نصیب ہو سکے جس طرح ماننے کی صورت میں ہوتی ہے، تو ارسال رسل سے بڑھ کر لغو اور عبث فعل اور کیا ہوگا؟ بظاہر ایسا خیال کرنے میں بڑی رواداری نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف اس بات کو منسوب کرنا خدا کو حکمت سے عاری ثابت کرنا ہے۔

(۵) ضمن ج کے تحت آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے جواب میں وہ بات کافی ہے جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں مگر جن دو آیتوں کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے ان کی مزید تشریح ضروری ہے۔ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ میں آمَنَ سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جن کا ذکر اہل کتاب کے لفظ سے کیا گیا ہے ان کا اہل کتاب ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ پر، اپنی کتاب پر، اپنے رسول یا رسولوں پر ملائکہ پر

اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں - اب آپ ہی فرمایئے کہ کس پر ایمان لانے کی کسر باقی رہ گئی ؟ اسی طرح مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ میں انہی اہل کتاب میں سے بعض کو جب مومن کہا گیا ہے تو اس کا مفہوم بھی بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ مومنین وہ اہل کتاب ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ؟ اور معلوم ہے کہ وہ چند ہی تھے، ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے اور انہی کو "فاسق" کہا گیا ہے - میں نے ترجمے میں ماضی اور حال کا فرق محض مفہوم کو واضح کرنے کے لیے کر دیا تھا - ورنہ اگر آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ "ان میں سے بعض مومن ہیں اور بعض فاسق" تو اس سے بھی مفہوم نہیں بدلتا۔

رہی دوسری آیت تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں بھی مدارج کا فرق ہے - ان میں سے جو گروہ راتوں کو عبادت کرتا اور کتاب پڑھتا ہے اور خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اور نہ صرف خود نیکوکار ہے بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے روکتا ہے، وہ اس گروہ سے تو بہر حال بہتر اور بلند تر درجہ میں ہے جو آیات الٰہی کا منکر اور حق سے تجاوز کرنے والا، اور بدکار و نافرمان ہے - ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں کو یکساں سمجھا جائے اور ان کا انجام ایک ہی سا ہو تو یہ عدل کے خلاف ہوگا ان بدکاروں کے مقابلہ میں ان نیکوکاروں کی قدر یقیناً ہونی چاہیے اور ہوگی بھی مگر یہ پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ان متقی اور نیک اہل کتاب کے حق میں بھی بہتر یہی تھا کہ وہ نبی امی پر ایمان لے آتے (وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ) کیونکہ خدا نے جس نبی کو بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اسکی بات مانی جائے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اور جو شخص خدا کے رسول کی بات نہیں مانتا وہ در اصل خدا کی بات نہیں مانتا (مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ) اسی کا نام "فسق" ہے (مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ) اور فسق کرنے والے کو دار الفاسقین ضرور دکھایا جائے گا۔

(۶) آیت يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ کی تفسیر میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ کلمۂ شک کے ساتھ ہے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پرہیزگار اور صالح اہل کتاب کو اللہ کی جنت میں سے کتنا حصہ

ملیگا اور ان کے اعمال کی قدر کس صورت میں ہوگی؟ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور اللہ نے اپنی کتاب میں جب اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے تو مجھے اور کسی کو بھی اپنی رائے سے اسکی تعیین کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں یقین کے ساتھ جو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ وہ بس اسی قدر ہے کہ نہ تو وہ اس ادنیٰ درجہ میں رکھے جائیں گے جو بدکار کافروں کے لیے ہے، اور ان کامل الایمان لوگوں کے ہم مرتبہ کردیئے جائیں گے جو تمام رسولوں کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمام کتابوں کے ساتھ قرآن مجید پر ایمان لائے ہیں۔

قرآن اور سنتِ رسولؐ

حضرت محترم ادام اللہ فضلکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! میں متواتر ضرورت حدیث کے سلسلہ میں آپکا سلسلہ مضامین دیکھ چکا ہوں۔ میں نہ تو اُن غالی مخالفین احادیث سے ہوں کہ کسی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھکرادوں اور نہ کورانہ روایات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں آپ سے ان دو اصولوں کے ماتحت امسال کے ماہ نامہ اول کے اشارات کی دی ہوئی اجازت کی رو سے کہ صرف تحقیق کے زاویہ نگاہ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری اور میرے احباب کی تسلی فرمائیں۔

اصول نمبر (۱) ؛ قرآن حکیم نجات کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ اگر کافی ہے تو تفصیلات نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضہ اولین قرار دی جائیں؟

مزید قابل غور امر یہ ہے کہ باقی ارکان اسلام (مثلاً زکوٰۃ۔ حج (جو سال میں یا عمر بھر میں ایک دفعہ ادا کرنے ضروری ہیں) کی تفصیلات تو قرآن بیان کرتا ہے لیکن نماز جو ایک دن میں ۵ دفعہ ادا کرنی ضروری ہے اس کی تفصیلات رکعتیں وغیرہ کیوں بیان نہیں کرتا؟

اصول نمبر (الف) مسلمانوں کی تباہی کا سبب کیا روایات نہیں ہیں؟

(ب) کوئی قوم جس کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اور جس کے لیے مختلف آرڈر موجود ہوں اس وقت یکجہتی نہیں کر سکتی جب تک ایک آرڈر پر اصول وحدت نہ ہو جائے۔ کیا روایات کے قبول کرتے ہوئے مسلم قوم کے لیے آپ ایک آرڈر کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ میرا ایمان ہے کہ اس وقت مسلمان صرف وحدت و یگانگت اور اتحاد دلی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اصولاً اس وحدت کا حل آپ کیا تجویز کریں گے۔

خادم عبد الحمید مرزا۔ سیالکوٹ

ترجمان القرآن - آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ تھوڑے سے تامل سے خود آپ ہی ان کا جواب نہ پا لیتے۔ ترجمان القرآن کے اُن مضامین میں بھی جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے، ان میں سے بعض سوالات کا حل موجود ہے تاہم جب آپ کو ان مسائل میں الجھن پیش آ رہی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی اس الجھن میں مبتلا ہیں تو ان کی تشفی کے لیے مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے:۔

(۱) قرآن حکیم "نجات" کے لیے نہیں بلکہ "ہدایت" کے لیے کافی ہے۔ اس کا کام صحیح فکر اور صحیح عمل کی راہ بتانا ہے، اور اس رہنمائی میں وہ یقیناً کافی ہے۔ مگر نجات کے لیے صرف قرآن کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلوص نیت کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں اور وہی اعتقاد رکھیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے، اور اسی قانون کے مطابق عمل کریں جس کے اصول قرآن نے مقرر کیے ہیں۔

(۲) ہدایت کے لیے قرآن کے کافی ہونے کا مفہوم بھی عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی کتاب کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی علم یا فن کی تعلیم کے لیے کافی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس فن کے جتنے گر ہیں، یا اس علم کے جتنے اہم مسائل ہیں وہ سب اس کتاب میں آ گئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر شخص جو اس کتاب کے الفاظ کو پڑھ سکتا ہو، اس کے تمام مطالب پر حاوی ہو جائے گا، اور محض کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کو اپنے فن میں اتنی مہارت بھی حاصل ہو جائے گی کہ وہ عملاً اس سے کام لے سکے۔ کتاب اپنی جگہ کتنی ہی کامل سہی۔ لیکن دوسری طرف اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف تو خود طالب علم میں ایک خاص استعداد موجود ہو، اور دوسری طرف ایک ماہر فن استاد بھی ہو جو نہ صرف کتاب کے

مطالب کی توضیح و تشریح کرے، بلکہ مشاہدہ اور مشق و تمرین کے ذریعہ سے فن کی وہ عملی تفصیلات بھی سکھا دے جو نہ تو کتابیں پوری طرح بیان ہو سکتی ہیں، اور نہ محض کتابیں پڑھنے سے کوئی ان پر علم و عمل کے اعتبار سے حاوی ہو سکتا ہے۔ بس یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے۔ وہ اس لحاظ سے ہدایت کے لیے کافی ہے کہ اس میں وہ صحیح علم موجود ہے جس کی روشنی میں انسان صراط مستقیم پر چل سکتا ہے اور وہ تمام اصول اس میں بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر اللہ کا پسندیدہ دین قائم ہے۔ مگر اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ طالب علم استفادہ کی خالص نیت رکھتا ہو اور ان علوم سے واقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک ماہر فن استاد موجود ہو جو کتاب اللہ کے نکات سمجھائے، آیات کا صحیح معنی و مفہوم بتائے، احکام پر خود عمل کر کے دکھائے، اور اصول قوانین کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ان کا تفصیلی ضابطہ مقرر کر دے۔ پہلی چیز کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔ رہی دوسری چیز تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن استاد کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اسکو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اسکی ضرورت کا منکر ہے، اور قرآن کو اس معنی میں کافی کہتا ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی ہدایت کی حاجت نہیں ہے، وہ درحقیقت یہ کہتا ہے کہ صرف قرآن کی تنزیل کافی تھی۔ خدا نے نعوذ باللہ یہ فعل عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا۔

(۳) آپ پوچھتے ہیں کہ "تفصیلات نماز وغیرہ جو "غیر از قرآن" ہیں کیوں فریضہ اولین قرار دی جائیں" اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تفصیلات نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہر فن طبیب فن طب کے کسی قاعدہ کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو اشکال کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اس کو "غیر از اقلیدس" نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور اہمات مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں، اور عملی تفصیلات

استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں، کیونکہ استاد عملی مظاہرے سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے، اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ کتاب کے حسن کلام اور اس کے کمال ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم وفنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بتاتا۔ رکعتوں کی تفصیل دیتا، رکوع وسجود اور قیام وقعود کی ہیئتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا، بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر ہیئت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا، پھر تکبیر تحریمہ سے لیکر سلام تک نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ بھی لکھتا، اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کیے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ "غیر از قرآن" نہ ہو۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا، اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔

(۴) یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں نماز وغیرہ کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صرف ارکان اسلام کی فرضیت پر زور دیا گیا ہے، ان کے قائم کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور کہیں کہیں ان کے ادا کرنے کے طریقوں کی طرف بھی اشارات کر دیے ہیں جو عملی تفصیلات پر کسی طرح بھی مشتمل نہیں کیے جا سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تفصیلات کو مقرر کرنے والا کون ہے؟ کیا وہ ہر شخص کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ جو جس طرح چاہے عمل کرے؟ اگر ایسا ہوتا تو دو مسلمانوں کی نمازیں بھی شاید ایک طریقے پر نہ ہوتیں۔ نہ دوسرے ارکان اسلام کے عملی طریقوں میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی۔ آج آپ جس "شیرازۂ قومی" کے انتشار کا ماتم فرما رہے ہیں، وہ صرف چند

آرڈروں" کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ تاہم ہر آرڈر میں لاکھوں کروڑوں مسلمان مجتمع ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص قرآن کے احکام کی عملی تفصیلات مقرر کرنے میں مختار رہتا، تو اسلام کے پیروؤں میں سرے سے کوئی آرڈر ہی نہ ہوتا۔ ان مختلف افراد کو جس چیز نے ایک قوم بنایا ہے وہ اعتقاد و عمل کی یک رنگی و یکسانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور یہ معلوم ہے کہ نظام جماعت کو قائم کرنے میں اعتقاد کے اشتراک سے بڑھ کر عمل کا اشتراک کارگر ہوتا ہے، کیونکہ انسان حواس کا بندہ ہے، اور اس کے حواس کو محسوس صورتیں ہی متاثر کرسکتی ہیں، اور انہی صورتوں کی یکسانی و یک رنگی اس میں جمعیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا طریقہائے عمل کو افراد کے اختیار پر چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ محض اعتقاد کے اشتراک سے مسلمان کبھی ایک قوم نہ بن سکتے۔ پھر جب وحدت قومی کے لئے اتحاد عمل ناگزیر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں وہ تفصیلات نہیں دیں جن سے یہ اتحاد حاصل ہو سکتا تھا تو آخر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون تھا جس کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کو تمام امت بالاتفاق واجب التقلید سمجھتی اور جس کی پیروی پر ہر زمانے اور ہر ملک کے کروڑوں متبعین اسلام مجتمع ہوجاتے؟ یہ آنحضرتؐ ہی کا فیض تعلیم تو ہے جس کی بدولت آج ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمان ایک ہی ہیئت سے نماز پڑھتے ہیں، ایک ہی طریقہ سے حج کرتے ہیں، ایک ہی زمانہ میں ایک ہی طرح روزے رکھتے ہیں۔ فرق جو کچھ بھی ہے محض جزئیات کا ہے، اور وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ کوئی مسلمان خود اپنے آپ کو ان جزئیات کے مقرر کرنے کا حقدار سمجھتا ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ ہر گروہ اپنے علم کے مطابق اسی جزئیہ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مسنون سمجھتا ہے جس پر وہ عامل ہے۔ باقی رہی حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امامت، اور آپ کی سنت کا واجب التقلید ہونا تو گنتی کے چند افراد کے سوا تمام امت اس پر متفق ہے، اور اسی اتفاق پر مسلمانوں کی وحدت قومی کا انحصار ہے۔

(۵) آپ قرآن مجید میں ایک مرتبہ پھر غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں روزہ، حج، اور زکوٰۃ کی تفصیلات کہاں ہیں؟ زکوٰۃ کے متعلق تو یہ بھی نہیں بتایا گیا ہے کہ کن چیزوں پر کتنی زکوٰۃ دی جائے، اور زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ حج اور روزہ کے جن احکام کو آپ تفصیلات سے تعبیر کررہے ہیں وہ نماز کے احکام سے بھی زیادہ مجمل ہیں۔ آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ قرآن مجید میں اول سے آخر تک اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ وہ زیادہ تر بیان ایمانیات کی

تعلیم میں صرف کیا جائے کیونکہ وہی دین کی بنیاد ہیں، اور عبادات و معاملات کے صرف اصول اور امہات مسائل بیان کر کے تفصیلات کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا جائے۔

(۶) مسلمانوں کی تباہی کا سبب روایات نہیں ہیں بلکہ نفسانیت، اور عصبیت جاہلیہ، اور فروع کو اصول سے بڑھ کر اہمیت دینے کی حماقت، اور کتاب اللہ و سنت رسول ؐ کو چھوڑ کر اپنے مزعومات میں حد سے زیادہ غلو کرنے کی عادت، اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا شوق ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو روایات کے اختلاف سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ روایات خواہ ضعیف ہوں یا قوی، اور ان کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہو، بہرحال ان سب کا مرجع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اور ان مختلف روایتوں کو ماننے والے اس امر میں بہرطور متفق ہیں کہ وہ سب آنحضرت صلعم کو اپنا متبوع اور پیشوا مانتے ہیں۔ علاوہ بریں روایات کے اختلاف سے صرف فروع میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔ باقی رہے اصول دین تو وہ سب کے سب کتاب پاک میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر، اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہے۔ پس اگر مسلمان خلوص نیت کے ساتھ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ وہ سب کتاب اللہ کے ماننے والے اور رسول اللہ ؐ کا اتباع کرنے والے ہیں، اور ان کے درمیان اصول دین مشترک ہیں، تو وہ اختلاف مٹ سکتا ہے جو تمام فتنوں کا منبع ہے۔ اور اگر اس کا ادراک نہ ہو تو روایات کا سارا دفتر نذر آتش کر دینے سے بھی اختلاف دور نہیں ہو سکتا۔ انسان کے نفس میں وہ شیطان موجود ہے جو قرآن کو بھی جنگ و جدل کا آلہ بنانے سے نہیں چوکتا۔

(۷) "ایک آرڈر" آپ کس معنی میں چاہتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ فروع میں کوئی اختلاف نہ ہو تو جب تک انسان کی فطرت نہ بدل جائے، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ بشری فطرت کے ساتھ تو یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف دو ہی آدمیوں کا نقطۂ نظر بالکلیہ ایک ہو جائے۔ لہٰذا ایسا "ایک آرڈر" تو کبھی قائم نہیں ہو سکتا جس میں کسی نوع کا اختلاف رائے اور اختلاف عمل سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ہاں اگر آپ "ایک آرڈر" سے مراد ایسا آرڈر لیتے ہیں جو اصولوں کی وحدت پر مبنی ہو تو خدا کی کتاب اور اس کے رسول ؐ نے ایسا ہی آرڈر قائم کیا تھا اور

وہ ہر وقت قائم ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان اصول اور فروع کا فرق سمجھ لیں اور دونوں کے مراتب میں امتیاز کرنا سیکھ جائیں۔

حدیث ادبر الشیطان لہ ضراط

جمادی الاولیٰ کے اشارات میں حدیث اذا نودی للصلوٰۃ ادبر الشیطان لہ ضراط کی جو شرح کی گئی تھی اس پر لاہور کے ایک صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ ان کا خط بجنسہٖ اسلیے درج نہیں کیا جاتا کہ اسکی زبان نامناسب ہے، اور اس میں علماء اہل حدیث کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ خلاصہ ان کے اعتراض کا یہ ہے :-

"آپ نے بخاری کے ادبر الشیطان لہ ضراط کو مسلم کے لہ حصاص کے سامنے بے حقیقت اور محض استعارہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان لوگوں کو کودن قرار دیا ہے جو حدیث بخاری کے الفاظ کو ظاہر پر محمول کرکے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ شیطان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں۔ لیکن علماء اہل حدیث اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شیطان کا مجسم ہونا اور اس کے پیٹ سے ریاح کا خارج ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ با ایں ہمہ آپ کے جواب سے نفس اعتراض پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اصل اعتراضات ہنوز طے نہیں ہوئے۔ از انجملہ ایک عام اعتراض جو روز سننے میں آتا ہے یہ ہے کہ اذان سن کر شیطان کا بھاگ جانا مگر نماز پڑھنے کی حالت میں معًا پھر نہ صرف لوٹ آنا بلکہ نمازیوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ آیا اذان نماز سے بہتر ہے یا خود نماز میں ایسی کوئی خرابی موجود ہے جس کے باعث شیطان کو ایسے تسلط کا موقع مل جاتا ہے کہ از روئے روایات خود رسول اللہ ؐ کم رکعتیں بھول جاتے اور بروئے حکایت علماء امام غزالی تک نماز میں نفس نماز سے منحرف ہو کر ادھر ادھر کے خیالات میں منہمک ہو جاتے تھے؟ براہ مہربانی واضح طور پر بتلائیے کہ نماز کے مقابلہ اذان کے شیطانی تسلط قائم ہونے کے وجہ کیا ہیں؟"

میں نے حدیث بخاری کے الفاظ کو حدیث مسلم کے الفاظ کے سامنے بے حقیقت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ مسلم میں جو الفاظ آئے ہیں وہ حدیث بخاری کے الفاظ کی تفسیر کرتے ہیں مختلف احادیث پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اذان کی تاثیر کو مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ ان سب ارشادات کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مقصد اذان کا یہ اثر بیان کرنا تھا کہ اس کو سُن کر شیطان بھاگ جاتا ہے، اور اس کے دوران میں انسان شیطانی وساوس سے محفوظ رہتا ہے۔

علماء اہل حدیث کی رائے اگر اس سے مختلف ہے تو ان کے دلائل معلوم ہونے کے بعد میں کچھ عرض کر سکوں گا میں نے جہاں تک کتاب اللہ کا مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت اور جن انسان و حیوان کی طرح مادی جسم نہیں رکھتے، بلکہ آتشین مخلوق ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ابلیس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ اور جنوں کے متعلق حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا ہے کہ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ اور ابلیس کے متعلق ارشاد ہے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کی حقیقت انسان سے مختلف ہے۔ نہ وہ انسان کا سا جسم رکھتا ہے اور نہ اس پر وہ احوال گزرتے ہیں جو انسان پر گزرا کرتے ہیں، مثل اکل طعام و اخراج ریاح وغیرہ۔ باقی رہی یہ بات کہ حدیث نبوی کے الفاظ لہٗ ضراطٌ کو شیطان کے صاحب شکم ہونے اور اس سے ریاح خارج ہونے کے لیے دلیل قرار دیا جائے تو میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ لغت عرب میں ضراط کا لفظ محض ریح شکم کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ مجازاً بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خفت کے معنی میں، چنانچہ بالوں کی کمی کو الضرط کہتے ہیں اور جس شخص کی ڈاڑھی ہلکی ہو اس کو اَضْرَط کہا جاتا ہے۔ جس عورت کی بھویں ہلکی ہوں وہ ضَرْطاء کہلاتی ہے۔ انکار اور استخفاف کے معنی ہیں۔ یقال اضرط فلان بفلان اذا استخف به وسخر منه۔ اور حدیث علی رضی اللہ عنہ میں ہے کہ انه دخل بیت المال فاضرط به ای استخف به وسخر منه۔ ناپسندیدگی اور کراہت کے معنی میں۔ وفی المثل الاکل سرطان والقضاء ضرطان۔ وتاویلہ ذالک تحب ان تاخذ وتکرہ ان ترد اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں شیطان کے بھاگنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضورؐ نے "ضراط" جو فرمایا ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بھاگتے وقت فی الواقع اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہوتے ہیں بلکہ اس سے مراد ایسی شدت فرار ہے جس میں خوف اور گراہٹ اور گھبراہٹ بھی شامل ہے۔ خود ہماری زبان کے محاورات میں بھی گوز کرنے کا لفظ حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے اضطراب اور خوف اور بدحواسی اور عجز وغیرہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ فلاں شخص گوز کرتا ہوا بھاگا تو کوئی بھی اس کا یہ مفہوم نہیں لیتا کہ فی الواقع بھاگتے وقت اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہو رہے تھے، بلکہ اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ سخت بدحواسی اور خوف کی حالت میں بھاگا۔ پس جب انسان کے متعلق یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے، حالانکہ انسان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہونا ایک امر طبعی ہے، تو پھر شیطان کے حق میں یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر کس طرح محمول کر سکتے ہیں، درانحالیکہ وہ انسان و حیوان کا سا جسم نہیں رکھتا؟

میں اپنے محدود علم کی بنا پر اس حدیث کے معنی کی جو تحقیق کر سکتا تھا وہ میں نے بیان کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص میری تحقیق کو غلط ثابت کر دے تو میں اس سے رجوع کرنے میں کبھی تامل نہ کروں گا۔ الحمدللہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی رائے کو وحی و الہام سمجھتے، اور اختلاف کرنے والوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ جب اذان سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے تو نماز پڑھنے میں واپس کیوں آجاتا ہے؟ اور کیا نماز اذان سے فروتر چیز ہے؟ تو اس کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس نے اذان اور نماز کے درمیان کیا فرق رکھا ہے جس کا یہ اثر ہے۔ یا پھر شیطان سے پوچھنا چاہیے کہ تو اذان کی آواز سن کر بھاگ کیوں جاتا ہے اور نماز پڑھنے میں واپس کیوں آجاتا ہے؟ مگر ایک بات میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ آپ کا خود اپنا تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں؟ دوسرے نماز پڑھنے والوں کے تجربات بھی اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اذان کی آواز سن کر ہر نمازی مسلمان کا دل یکایک ذکر الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور یہ چند لمحے شیطانی وساوس سے خالی گزرتے ہیں، لیکن نماز پڑھتے ہی طرح طرح کے خیالات آکر اس کو گھیر لیتے ہیں، اور ایسی باتیں یاد آتی ہیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتیں؟ اگر واقعہ ہے اور آپ کا ذاتی تجربہ

بھی اس کا شاہد ہے تو آپ اس کی تصدیق کو اس کی وجہ معلوم ہونے پر کیوں موقوف رکھتے ہیں؟ کیا واقعہ کو واقعہ تسلیم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو جائے؟ اگر کسی واقعہ کی وجہ نہ معلوم ہو تو کیا آپ اس کے واقعہ ہونے سے انکار کر دیں گے؟ اگر آپ کے سر میں درد ہو اور اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو کیا آپ اپنے احساس درد کو جھٹلا دیں گے؟ یہ بات تو بالکل عام فہم COMMON SENSE سے تعلق رکھتی ہے کہ واقعہ کو واقعہ ماننے کے لیے وجہ کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔ آپ دنیا کے بہت سے واقعات کو تسلیم کرتے ہیں درانحالیکہ آپ کو ان کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ پھر آخر یہ حجت طلبی مذہبی لٹریچر ہی کے ساتھ کیوں مخصوص ہو گئی ہے کہ اگر اس کے کسی بیان کی تائید تجربہ و مشاہدہ سے بھی ہو جائے تو اسے ماننے کو دل نہیں چاہتا جب تک کہ اس کی وجہ معلوم نہ ہو جائے؟ اور اگر اس کی وجہ بھی معلوم ہو جائے تو پھر تصدیق میں یہ سوال مانع ہو جاتا ہے کہ جب اس خاص معاملہ میں یہ واقعہ پیش آتا ہے تو ایک دوسرے معاملہ میں بھی یہی واقعہ کیوں پیش نہیں آتا؟

آپ پوچھتے ہیں کہ کیا نماز اذان سے بہتر ہے یا نماز میں کوئی ایسی خرابی موجود ہے جس کے باعث حالت نماز میں شیطان کو تسلط کا موقع مل جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ شیطان کے بھاگنے اور واپس آجانے سے نہ تو نماز پر اذان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نہ نماز میں کسی خرابی کا موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اذان اور نماز کی کیفیات میں فرق ہے۔ شیطان کے لیے ان دونوں میں جو کچھ فرق ہے اس کو ہم نہیں جان سکتے، نہ وہ ہم کو بتایا گیا ہے۔ البتہ نفس انسانی کے لیے ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ نفسیات کا ایک معمولی نکتہ ہے کہ جب کوئی آواز انسان کی توجہ کو دفعۃً اپنی طرف جذب کرتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے انسان کا نفس دوسرے مشاغل سے ہٹ کر اس کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب انسان کسی کام میں زیادہ دیر تک مشغول رہتا ہے تو بغیر خاص کوشش کے اس کو پوری جمعیت خاطر — CNOCENTRATION حاصل نہیں ہوتی، اور خیالات ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں۔ عوام پر یہ حالت اکثر طاری ہوتی ہے کیونکہ وہ جمعیت خاطر اور کامل توجہ الی اللہ بہم پہنچانے پر کم قادر ہوتے ہیں لیکن خواص بھی جو اس پر خاص قدرت رکھتے ہیں کبھی کبھی تقاضائے بشریت سے بعض اضطراری طور پر انتشار خیال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان اور نماز کا یہ فرق ان کی کیفیات کے فرق پر مبنی ہے نہ کہ ان کی جناب میں ان کی مقبولیت اور ان کے مراتب کے فرق پر۔